حیات قومی

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

وَلَہُ الْحَمْد۔

انسان سلسلۂ کائنات کی ایک کڑی ہے، اس لیے حیات و موت کے قوانین جو تمام اشیاء میں کارفرما ہیں، ان سے یہ مستثنٰی نہیں ہوسکتا۔ کارگاہ قدرت انسان کے لیے ایک مدرسۂ تعلیم و تربیت ہے جس میں انسان اپنی زندگی کے لئے مفید نتائج حاصل کرسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ابتدائی منزل وہ ہے جہاں نشوونما اور حرکت کا پتہ نہیں ہے۔ صرف جسمیّت پائی جاتی ہے۔ یہاں دو چیزیں کارفرما ہیں: ایک قوت جذب دوسرے قوت دفع۔ کسی پتھر کو آپ اٹھانا چاہیں تو کوئی طاقت آپ سے مقابلہ کرے گی، یہ اس کی مرکز کی جانب کشش ہے۔ اس سے اشیاء میں وزن پیدا ہوتا ہے۔

مقدار کی جسامت یا کثرت سنگینی کی باعث نہیں ہوتی۔ ایک بڑا گولا روئی کا دیکھنے میں بڑا اور ایک لوہے کا ٹکڑا اس کے مقابلہ میں مختصر مگر وہ باوجود اپنی کثرت و وسعت کے سبک ہے کیونکہ اس میں مرکز کی طرف کشش کم ہے اور یہ باوجود مقدار کم ہونے کے سنگین ہے کیونکہ اس میں مرکز سے ارتباط زیادہ ہے۔

دوسری چیز قوت دفع، اس سے سختی و صلابت پیدا ہوتی ہے۔ کسی لوہے کے ٹکڑے کو دبایئے تو کوئی چیز آپ سے جنگ کرتی نظر آئے گی۔ یہ اس کی قوت دفع ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کے باہمی اجزا کی کشش اور ارتباط کا نتیجہ ہے۔

جتنی اجزاء میں باہمی کشش زیادہ ہوگی اتنا غیر کو اس میں جگہ پیدا کرنے اور آنے میں دشواری محسوس ہوگی۔ ان اجسام کی حیات و موت ان ہی جذب و دفع کی طاقتوں کے برقرار رہنے سے وابستہ ہے۔

ایک لوہے کی سلاخ ایک وقت میں توڑیئے تو نہ ٹوٹے گی، لیکن جب اس میں زنگ آجائے اور مدت کافی گذر جائے تو دوسرے وقت میں ہاتھ لگتے ہی ٹوٹ جائے گی اور ایک درجہ یہ ہوگا کہ انگلیوں کے دبانے سے ریزہ ریزہ ہوجائے۔ اب اس میں نہ اتنا وزن ہے نہ قوت مدافعت۔

اس لیے کہ اس کے باہمی اجزا کی کشش ختم ہوچکی ہے اور مرکز کے ساتھ اس کا تعلق کم ہوگیا ہے۔

جمادات کے بعد نباتات کا درجہ ہے۔ ان کی حیات کا خاص جوہر قوّت نشوونما ہے مگر یہ نشوونما اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ اپنی اصل سے متصل ہیں لیکن اگر کوئی جزو اصل سے جدا ہوگیا تو ممکن ہے کچھ دیر سابقہ تعلق کے فیض سے اس میں شادابی اور طراوت باقی رہے لیکن بادسموم کے جھونکے اس کو بہت جلد ختم کردیں گے۔

تیسری منزل حیوانیت کی ہے۔

یہاں جزو کا کل کے ساتھ شریک حیات ہونا علاوہ اتصال کے کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ کو عرصہ تک حرکت نہ دے اور ایک ہی حالت پر چھوڑ دے تو کافی مدت گزر جانے کے بعد وہ ہاتھ خشک ہوجائے گا۔

آنکھوں کو بند کرلے اور ان سے کام نہ لے تو آنکھیں بے نور ہوجائیں گی دیکھئے تو وہ ہاتھ جسم سے متصل ہے، پھر بھی مردہ

ہوگیا۔ اس لیے کہ اس نے وہ کام چھوڑ دیا جو اس سے متعلق تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صنف حیوان میں ہر جزو کے حیات کا معیار اپنے کل کے ساتھ اتحاد عمل قائم رکھنا ہے۔ اگر اس جزو نے کل کا کام چھوڑ دیا تو وہ مردہ ہوجائے گا، باوجودیکہ کل موجود ہے بلکہ جزو اپنے کل کے لیے ایک وبال بن جائے گا۔ کیونکہ اس جزو کا رہنا بھی عیب ہے اور اس کا کاٹ کر جدا کر دینا بھی عیب ہے۔

اب آپ ان مثالوں سے انسانی زندگی کا جائزہ لیجئے۔ فرق اتنا ہے کہ جمادی، نباتی اور حیوانی زندگیاں انفرادی حیثیت رکھتی ہیں اور انسانی زندگی اجتماعیت سے وابستہ ہے۔ اس کا مرکز اجتماعی مرکز ہوگا۔ اس کا اتصال روحانی اتصال ہوگا اور جو زندگی حاصل ہوگی وہ قومی زندگی ہوگی۔

''قومیت'' کی بنیاد بہت سے افراد کے کسی ایک رشتہ میں منسلک ہونے پر ہے۔ اب یہ ایک چیز کیا ہو جس پر بنیاد قومیت قرار دی جائے؟ یہاں زاویۂ نظر مختلف ہوجاتا ہے کچھ لوگوں نے نسل کو بنیاد قومیت قرار دیا، کچھ نے رنگ کو اور بہت سے لوگ وطن کو بنیاد قرار دینا چاہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ سب چیزیں تنگ خیالی کا نتیجہ ہیں اور محدود ہیں ان میں سے کوئی بات بھی عالم انسانی میں ہمہ گیر برادری قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ یہ چیزیں دنیائے انسانیت میں ایک مستقل بنیاد ہیں افتراق کی جو کبھی اجتماع سے نہیں بدل سکتا۔

اسلام نے ان سب سے بالاتر ایک عالمگیر قومیّت کی بنیاد قائم کی۔ وہ خدائے واحد کی طرف انتساب سے پیدا ہوتی ہے، جس میں نہ نسل کی تفریق ہے، نہ رنگ کی، نہ سرزمین کی اس رابطۂ وحدت پر ایمان رکھنے والے سب ایک قوم ہیں، چاہے وہ کسی نسل، کسی رنگ اور کسی ملک سے تعلق رکھتے ہوں (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃ)۔

اس میں ہمہ گیر بننے کی صلاحیت اور قوت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اس رابطۂ اتحاد کو نہ ماننے سے اس برادری سے خارج ہوجائیں، یہ اپنے اختیار کی بات ہے۔ اس سے اصول کی ہمہ گیری اور عمومیت پر حرف نہیں آتا۔

ہم جو 'حیات قومی' کے عنوان پر بحث کر رہے ہیں وہ 'قومیت' کے اسی معیار کو پیش نظر رکھ کر جس میں عالمگیر وسعت موجود ہے۔ کائنات کے درس نے ہم کو زندگی کے لئے ایک 'مرکز' کی ضرورت کا پتہ دیا ہے۔ یہ مرکز کیسا ہونا چاہیے؟ یاد رکھیے کہ ہر شئے کا مرکز اس کی جنس سے وہ ہوتا ہے جو اس کے صفات کا مخزن ہو۔ اجسام کا مرکز کشش، جسم، نباتات کی حیات نباتی کا مرکز ان کی اصل ہے جو نشوونما کی طاقتوں کا اصلی خزانہ ہو۔

اعضائے حیات کا مرکز اس کا قلب ہے جو تمام جسم کے حصّوں میں زندگی کا خون پہنچاتا ہے۔ انسان کی قومی زندگی کے لیے بھی مرکز ہونا چاہئے۔ پھر یہ مرکز کون ہو؟ ضرورت ہے کہ وہ اسی نوع انسانی میں ایک ایسا بلند نقطہ ہو جو انسانی صفات کا خزانہ، انسانیت کا قلب اور انسانی کمالات کا سرچشمہ ہو۔

وہ 'انسان کامل' ہوگا جو عالم انسانی کے لیے اجتماعی مرکز بن سکتا ہے اور تمام دنیائے انسانیت اس سے وابستگی کے ساتھ اجتماعی زندگی کے فیوض سے بہرہ مند ہوسکتی ہے۔

ہماری 'حیات قومی' کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ ہم اپنے مرکز کی صحیح طور پر شناخت کریں کیونکہ اگر مرکزی نقطہ کی تعیین میں غلطی ہوگئی تو پورا دائرہ اجتماعی غلط ہوجائے گا اور قومیت کا تمام نظام اپنے محور سے ہٹ جائے گا۔

دوسرا نکتہ:

ہمیں مرکز کی طرف کشش ہو۔ اگر مرکز کی جانب کشش نہ ہوئی تو جماعت میں وزن پیدا نہیں ہوسکتا۔

افراد کی کثرت اتنی ضروری نہیں ہے جتنا یہ جذب مرکزی ضروری ہے، اس جذب اور کشش کا بہترین نمونہ کربلا کے مجاہدین نے پیش کیا ہے جن کے افعال، جن کے ارادے اور جن کے خیالات حضرت امام حسینؑ کے عمل، ارادہ اور خیال کے اندر غرق ہوگئے تھے۔ گویا ان کی ہستیاں اپنے امام کی محبت و

اطاعت میں فنا ہوگئی تھیں۔

تیسرا نکتہ:

قوم کے افراد میں باہمی ارتباط اور احساس قومیت پیدا ہونا چاہئے۔ یہ ارتباط جتنا قوی ہوگا اور باہمی کشش جتنی زیادہ ہوگی، اتنی ہی قوت مدافعت پیدا ہوگی۔

ہمارے افراد اگر بہت کثرت سے ہیں مگر آپس میں اتحاد و اتفاق کا رابطہ مستحکم نہیں تو اغیار کو ہم میں دراندازی اور مداخلت کا موقع ہوگا اور وہ ہمیں دبا بھی سکیں گے اور ہمیں تقسیم بھی آسانی کے ساتھ کردیں گے۔ لیکن اگر ہم میں باہمی اتفاق و اتحاد مکمل ہوا، تو چاہے ہماری تعداد کم ہو لیکن نہ ہم کو دشمن دبا سکے گا، نہ ہم میں پھوٹ ڈال سکے گا۔ یہ قومی زندگی کے لیے نہایت ضروری چیز ہے۔

چوتھا نکتہ:

اپنی قومی زندگی کے لیے ہمیں اپنی اصل سے متصل اور وابستہ رہنا ضروری ہے۔ اگر ہم نے ترقی کے شوق اور بلندی کے ذوق میں ہم رنگی جماعت اختیار کی اور اغیار کی اندھا دھند تقلید شروع کردی اس طرح کہ اپنی اصل سے جدا ہوگئے تو ہم زندہ بھی ہوں گے اور ممکن ہے ترقی یافتہ بھی سمجھے جائیں مگر وہ ''ہم'' نہ ہوں گے کوئی اور ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ ہماری ''قومیت'' کی تشکیل جن اصول پر ہوئی ہے ان اصول کو قائم رہنا چاہئے۔ ورنہ ہماری ''قومی زندگی'' برقرار نہیں سمجھی جاسکتی۔

پانچواں نکتہ:

زندگی کی بقا کے لیے ہم کو صرف خیالی اور اعتقادی جذب و اتصال کافی نہیں ہے بلکہ عمل کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے ''عمل'' سے ہاتھ روک لیا تو باوجود اسمی و رسمی اتّصال کے ہم اسی طرح مردہ ہوجائیں گے جس طرح عرصہ تک معطل رہنے سے ہاتھ مردہ ہوجاتا ہے باوجودیکہ وہ اپنے کل سے وابستہ ہو۔

بے شک جس طرح یہ ہاتھ مردہ ہونے کے بعد اس کل کے لیے باعثِ آزار ہے، نہ اس کے رہنے سے آرام ہے، نہ اس کے جدا ہونے ہی سے رونق ہے، اسی طرح قوم کے افراد اپنی بداعمالیوں سے اپنے مرکز کے لئے انتہائی تکلیف کا باعث ہیں۔ نہ ان کا کٹ کر جدا ہوجانا ہی گوارا کیا جاسکتا ہے، نہ ان کا اپنی بداعمالیوں کے ساتھ قوم میں باقی رہنا ہی قوم کے لئے مفید ہے۔

یہی ہے وہ امر جو امام نے فرمایا ہے اپنے شیعوں سے مخاطب ہوکر ''کونوا لنازینا ولاتکونوا علینا شینا''۔

''ہمارے لیے زیب و زینت کا باعث ہو اور ہمارے لئے عیب اور نقص کا باعث نہ ہو۔''

یقینا ہماری زندگی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ ہم ان تعلیمات پر عمل کریں جو ہماری قومی زندگی کے لیے ہمیں دیئے گئے تھے۔

ان نکات کے پیشِ نظر جب ہم اپنی قومی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے مرکز کے انتخاب میں تو بے شک امکانی حد تک بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے اتنی چھان بین ضروری سمجھی ہو جتنی ہم نے ضروری سمجھی ہے اور ہمیں ناز ہے کہ ہم نے جن ہستیوں کو اپنی اجتماعی مرکزیت کا محل قرار دیا ہے ان کے مرکزی اوصاف اور انسانی کمالات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

مرکز کی طرف جذب و کشش میں بھی جہاں تک عقیدت و محبت کا تعلق ہے، ہم دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ اگرچہ ہمارے سامنے جو معیاری نمونے ہیں ان کے لحاظ سے ہم اپنے کو صفر پاتے ہیں، پھر بھی دوسرے اقوام کے مقابل میں ہم اپنی اس خصوصیت پر ناز کر سکتے ہیں۔

یہ مرکزی جذب ہی ہے جس کی بدولت ہم لاکھوں روپیہ ہر سال عزاداری میں صرف کردیتے ہیں اور یہ مرکزی کشش ہی ہے جس کی وجہ سے وقت پڑنے پر ہمارے ہزاروں آدمی قید و بند کی مصیبتیں جھیلنے پر تیار ہوجاتے ہیں۔

اسی مرکزی جذب کا نتیجہ ہے کہ تیرہ سو برس گزرنے پر ۱۳۶۱ھ میں شہید کربلا کی سیزدہ صد سالہ یادگار کے قیام کا انتظام

ہورہا ہے جس میں غیر اقوام تک کارنامۂ حسینی کے نشر و اشاعت کا کام بڑے پیمانہ پر انجام دیا جائے گا۔

لیکن جب ہم تیسرے جزو پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اپنی قومیت کی دنیا ویران نظر آتی ہے۔ ہم میں باہمی ارتباط اور احساس قومیت مفقود ہے اور اتحاد و اتفاق نایاب ہے۔

ہمارے بڑے افراد اپنی ترقی اس میں منحصر سمجھتے ہیں کہ وہ عملی سرگرمیوں میں دوسری جماعتوں کے ساتھ وابستہ ہو جائیں۔ ان میں کے بہت سے اس وقت میں اپنے کو شیعہ کہنے سے شرمانے اور جھجھکنے لگتے ہیں۔ وہ اس کو ''رواداری'' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ رواداری یہ نہیں ہے کہ انسان دوسروں کی خاطر اپنے خصوصیات قومی کو تج دے یا درد، دکھ میں اپنی قوم کے افراد کا ساتھ نہ دے بلکہ رواداری یہ ہے کہ اپنے قومی احساس، قومی ہمدردی، قومی یکجہتی کے ساتھ مشترک مقاصد میں دوسروں کا بھی ساتھ دے اور منافرت اور بیجا تعصب سے کام نہ لے۔

یہ لوگ اپنے سے کٹ کر دوسروں سے ملتے ہیں مگر دوسرے بھی انہیں اپنا نہیں سمجھتے بلکہ اپنا کام نکالتے رہتے ہیں اور وقت گذرنے پر دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیتے ہیں۔

رہ گئے عام افراد، وہ مذہب اور قوم پر جان دینے کا دعویٰ رکھتے ہیں مگر آپس میں یکجہتی اور ہم آہنگی نام کو بھی نہیں، ہمدردی و اعانت باہمی کا پتہ نہیں۔ ذاتی کاموں میں ایک دوسرے کا ہاتھ کیا بٹائے گا۔ کوئی مشترک قومی یا مذہبی کام تک اگر کوئی ایک شخص اپنے ہاتھ میں لے لے تو دوسرے اس میں حصہ لینے سے اور سرگرمی کے ساتھ امداد کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس بناء پر کہ وہ کام ایک شخص کا ہو گیا۔ اب دوسروں کو مطلب نہیں رہا۔ یہ صورت حال انتہائی افسوسناک ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ قومیت کی بنیاد یک جہتی اور ارتباط باہمی پر ہے۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو افراد چاہے لاکھوں ہوں مگر ایک قوم کا وجود نہیں ہے۔

بہت سے قومیت اور ترقی کے بلند بانگ دعویٰ کرنے والے ترقی کا راز اغیار کی تقلید میں مضمر سمجھتے ہیں۔ ان کی یہ ترقیاں اگر کوئی اصلیت رکھتی بھی ہوں تو وہ انفرادی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ قومی ترقی وہ ہے جو خصوصیات قومی کی حفاظت کے ساتھ ہو۔

اب سب سے اہم اور آخری جز و عمل کا ہے، اس لحاظ سے جب ہم اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے مرکز سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ ہم نے ان تعلیمات کو فراموش کر دیا جو ہمیں دیئے گئے تھے۔ ان بہترین عملی مثالوں کو نظر انداز کر دیا جن کی پیروی ہمارے لیے باعث نجات تھی۔ جبکہ زندگی حرکت و عمل کا نام ہے تو یقینا ہماری قوم زندگی کی نعمت سے محروم ہے، اس لیے کہ ہم نے حرکت اور عمل کو ترک کر دیا ہے۔

دو شعبے ہیں: حقوق اللہ اور حقوق الناس۔ ہم نے کس کو ان میں سے آباد کر رکھا ہے؟ اصلاح معاد اور اصلاح معاش، ہم نے ان میں سے کس کی فکر رکھی ہے؟ حقوق اللہ کے لحاظ سے نظر ڈالئے تو ہماری مسجدیں ویران نظر آئیں گی، اوقات نماز ہمارے شاکی اور قرآن کریم ہمارے تغافل سے دردمند نظر آئے گا۔

حقوق الناس پر نظر ڈالیے تو سوائے ظاہر داری اور اقتدار پرستی کے اخوت، مساوات اور مواسات و ہمدردی کا نشان نہ ملے گا۔ اگر یقین نہ ہو تو شاہراہ عام پر کسی غریب کا جنازہ دیکھ لیجئے جس کے ساتھ مشایعت کرنے والے دو چار بھی نظر نہ آئیں گے۔

اصلاح معاد کے لیے عمل کی فکر نہ رہی سمجھ لئے کہ محبت اہلبیتؑ کافی ہے اور رونا حضرت امام حسینؑ پر نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ بس اب اعمال و افعال کی ضرورت باقی نہ رہی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ محبت بغیر اطاعت ہوتی نہیں۔ معصومؑ نے خود فرمادیا: **"من اطاع اللّٰہ فھو لنا محب و من عصی اللّٰہ فھو لنا عدوّ"** ''جو اللہ کی اطاعت کرے وہ ہمارا دوست ہے اور جو اللہ کی نافرمانی کرے وہ ہمارا دشمن ہے۔''

رہ گیا، حضرت سید الشہداء علیہ السلام پر گریہ، تو ظاہر ہے کہ گریہ وہی کارآمد ہوگا جو محبت و معرفت کے ساتھ ہو ورنہ

مصیبت کے فطری اثر سے مجبور ہوکر تو دشمن تک روئے تھے، پھر کیا یہ گریہ ان کے لیے بہشت کا موجب ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

اصلاح معاش کا یہ عالم، کہ جتنے ذرائع آمدنی اور سرمایہ کی فراہمی کے ہیں ان سب کو ہم نے ترک کیا۔ تجارت، صنعت و حرفت اور مزدوری یہی وہ چیزیں ہیں جو زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ ان سب کو ہم نے ''ننگ و نام'' کے موہوم خیال پر ترک کر دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف ضروریات زندگی میں ہم اغیار کے دست نگر ہو گئے دوسری طرف تمام سرمایہ ہمارا نذر اغیار ہوگیا۔ وہ بنتے گئے اور ہم بگڑتے گئے۔ اور اب بڑے بڑے مقتدر اشخاص اور گھرانے ہم میں کے مفلوک الحال اور نان شبینہ کو محتاج ہیں، جب کہ ان کی دولت سے سیکڑوں معمولی آدمی لاکھوں کے مالک بن گئے۔

ذرائع آمدنی کا یہ عالم اور اس کے ساتھ رسوم بیجا میں فضول خرچیاں ہماری سب سے بڑھی ہوئی۔ جو تقریب آئے گی اپنے ساتھ مصارف کا ایک سیلاب لائے گی جو ہماری رہی سہی پونجی کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا یا قرضہ کا ایک پہاڑ سر پر لائے گی جس کا بوجھ آخر کو دبا کر ہماری ہڈیوں کے ڈھانچہ کو سرمہ سا بنادے گا۔ یہ صورت حال اسی طرح اگر قائم رہی تو زندگی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

اگر کوئی بندۂ خدا جرأت کر کے دوکان رکھ لیتا ہے تو اسے زیادہ دن تک قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ نو آموز ہونے کی وجہ سے اصول تجارت سے واقف نہیں، اس لئے غلطیاں کریں گے۔ ثبات و استقلال سے کام لیں تو غلطیوں کے بعد سنبھلیں اور ترقی کے راستے معلوم کریں مگر یہ پہلے ہی دفعہ ٹھوکر کھانے کے بعد ہمّت ہار جاتے ہیں اس لئے دوکان کو بند کر دیتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ پہلے ہی دن سے نفع کے طالب ہوجاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ دوکان ان کے ضروریات زندگی کو پورا کرنے لگے اس کا نتیجہ ''گراں فروشی'' اور ''بدمعاملگی'' کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ حالانکہ شروع میں ان کو صبر و استقلال کے ساتھ دوکان پر لگاتے رہنا چاہئے تھا اور اس سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ایسا کرتے تو ایک وقت میں وہ دوکان ان کی ضرورت سے زیادہ ان کو دینے کے لائق ہوجاتی۔

تیسری بات یہ ہے کہ اپنی قوم کے افراد میں احساس قومیت نہیں، اس لئے وہ اس دوکان سے خریداری ضروری نہیں سمجھتے۔ جبکہ دوسری قوموں کے افراد میں احساس قومیت موجود ہے اس لیے وہ اپنے لوگوں کی دوکانیں چھوڑ کر اس دوکان پر نہیں آتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری اس دوکان سے نہ اپنے خریدتے ہیں اور نہ اغیار اس پر آتے ہیں۔ پھر یہ دوکان چل کیسے سکتی ہے؟ ہمارے بھائیوں میں یہ احساس پیدا ہونا چاہئے کہ وہ ایک پیسہ زائد بھی دینا پڑے تب بھی اپنے بھائی کی دوکان کو مقدم رکھیں گے۔ پیسہ زائد جائے گا تو کس کے پاس جائے گا ہر پھر کے اپنی قوم ہی میں رہے گا۔ اگر یہ بات پیدا ہوجائے تو پھر دیکھئے تجارتیں کس طرح فروغ پاتی ہیں۔

رسوم بیجا جو ہماری زندگی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں، ان کا ترک کرنا سب سے پہلی فرصت میں ہمارے لیے ضروری ہے۔

ہمیں تعلیمات بھی دیئے گئے ہیں اور ہمارے سامنے عملی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں جن کی پیروی ہمارے لیے زندگی کی ضامن ہے۔

''تجارت اور اسلام'' (امامیہ مشن کا رسالہ) ملاحظہ کیجئے اور ''ہمارے رسوم و قیود'' یا ''شادی خانہ آبادی'' کا مطالعہ فرمائیے تو آپ کو رؤسائے ملت کے تعلیمات اور پیشوایان دین کی زندگی کے صحیح نمونے نظر آئیں گے جن سے آپ اپنی زندگی کی صحیح لائنوں پر تعمیر کر سکتے ہیں۔

اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو زندگی ہم کو سلام رخصت کر کے ہمیشہ کے لئے وداع ہوجائے گی اور ہم ''حیات قومی'' کی نعمت سے بالکل محروم ہوجائیں گے۔ خدا ہم کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام

(۲۶ رجمادی الثانی ۱۳۶۰ھ)